نوٹس ہی نہیں لیتے سرے سے"۔

"ٹیلی ویژن پر کیا دیکھتا ہے....."

"فٹ بال میچ، پہلوانی کے دنگل اور سائنس فکشن"

"تم بھی پاس بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھ لیا کرو....."

"مجھے ایسے پروگراموں میں کوئی دلچسپی نہیں ابا..... مجھے کشتی دیکھ کر تے آتی ہے"

"اور فٹ بال میچ.....؟"

"اس میں کیا پڑا ہے، پھر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا ابا کچھ ہاؤس ورک کرنا ہوتا ہے۔ بچوں کو ہوم ورک کرانا پڑتا ہے۔ ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں کام کر کر کر کے"۔

"تمہارے شوہر کی معقول آمدنی ہے، نوکری چھوڑ دو اور گھر بیٹھو آرام سے"

"اور سارا دن کیا کروں مکھیاں ماروں..... انتظار کروں شوہر کا..... بچوں کا"

میں نے کہنا چاہا کہ یہ دونوں مشغلے ہڈیاں تڑوانے سے بہتر ہیں۔ پھر کام کا رڈی رونا بھی ختم ہو جائے گا ہاؤس ورک سے دل لگا رہے ہوگا، لیکن بیٹی کے معاملے میں باپ انصاف کی طرف نہیں بیٹی کی محبت کا طرف دار ہوتا ہے۔ اس نے دو چار بار اپنے شوہر کے خلاف محاذ آرائی کی۔ میں نے ٹکٹ بنوایا اور امریکہ چلا آیا۔

اس کے بہت بعد مجھے علم ہوا کہ ڈاکٹر کی داستان بھی جہانگیر سے کچھ کم ناخوش گوار نہیں تھی اور ارجمند بھی اپنی طرز کی شاہدہ ہی تھی، لیکن اس آگاہی کے باوجود میرا دل ارجمند ہی کے لئے پریشان رہتا۔ مجھے شاہدہ پر کبھی ترس نہ آیا۔ میرے دل میں ڈاکٹر بیٹے کے لئے کئی ہمدردی نہ جاگی.....

شاید اسی لئے تفکر کا حکم آیا، جذبات کی رو میں بہہ کر قومیں اور افراد کبھی انصاف نہیں کر پاتیں، ان کی سوچ ہمیشہ ٹیڑھ اور تعصب سے بھری ہوتی ہے۔

فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ بیگل رکھ کر فون سنتی ہے۔ پھر لوٹ کر کہتی ہے.....

"یہ تو حال ہے بلال کا"۔

میں ناشتہ کر رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ میرے نواسے جمشید اور قیصر بڑے شوق سے بیگل کھاتے ہیں۔ وہ حلوہ پوری، پراٹھا انڈہ کھانے کی لذت سے نا آشنا ہیں۔

''کیوں کیا ہوا بلال کو.....''

''جہاں کار پارک کی تھی۔ وہاں سے ہسپتال تک جاتے جاتے سارے بھیگ گئے''۔

''بیچارہ.....''

''بیچارہ نہیں ایڈیٹ..... انسان کو اتنا تو پتہ ہونا چاہئے کہ صبح کام پر جاتے وقت چھتری ساتھ رکھنی ہے..... بے دھیانے اس قدر ہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔ امریکہ کا موسم کدھر جا رہا ہے۔ اتنے سال یہاں رہنے کے باوجود ابھی تک نہیں جانتا کہ Valentine Day کس طرح منایا جاتا ہے۔ گروسریز لینے جائے گا تو ایسی ایسی چیزیں اٹھا لائے گا جن کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ سب کچھ بھول جائے گا جن کی فہرست بنا کر دی تھی۔ کبھی ہماری شادی کی Anniversary یاد نہیں رہتی۔ پاگل پرانے مریضوں کو ہیپی کرسمس کے کارڈ بھیجنا کبھی نہیں بھولا اور گھر والوں کا پتہ ہی نہیں کہ ان کی برتھ ڈے کب ہوتی ہے..... پوچھیں ابو۔ پوچھیں کبھی بلال سے جمشید پرپ میں ہے کہ کلاس ون میں۔ بتا نہیں سکیں گے آپ کو..... میری سالگرہ کو تو چولہے میں پھینکیں کبھی یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ بچوں کا جنم دن کون سا ہے.....''

ارجمند بولتی چلی گئی اور میں بیگل پر مکھن جیم لگاتا رہا۔

ارجمند جس طرح بول رہی تھی لگتا تھا کہ وہ اور بلال ازلی دشمن ہیں۔

میں نے توے پر ٹھنڈے چھینے پھینکنے کے انداز میں پوچھا..... ''کیوں بھئی بلال اچھا ڈاکٹر ہے..... ہے ناں''

کچھ دیر وہ سوچتی رہی۔ پھر بولی..... ''ہاں ہے شاید..... ہسپتال والے تعریف

کرتے ہیں"

"پھر تمہارے لئے کیا یہ کافی نہیں؟..... وہ تمہاری کفالت میں پورا اترتا ہے..... ہے ناں؟"

"نہیں..... وقت بدل چکا ہے ابو۔ ابو مرد کو اور جہتوں پر بھی لڑنا پڑتا ہے۔ اسے گھر پر بھی پوری مدد کرنی چاہئے"

"وہ کیوں؟..... کیا وہ کافی پیسے نہیں دیتا....."

"پیسے کی بات نہیں ہے ابو۔ پیسے تو کافی ہیں، لیکن میں سارا دن کیا کروں۔ مجھے بھی تو اپنی شناخت چاہئے۔ بلال ابھی بھی آپ کے زمانے میں رہ رہا ہے، بلکہ دادا جی کے وقتوں میں زندہ ہے۔ اب عورت پاؤں کی جوتی نہیں، مرد نہاتا دھوتا گھوڑا نہیں ہوا کرتا آج کل۔ عورت کا اب سسرال سے جنازہ ہی نہیں اٹھتا۔ وہ اپنی مرضی سے واک آؤٹ بھی کر سکتی ہے..... وہ بڑبڑاتی چلی جاتی ہے۔ گھر پر کوئی موجود نہیں۔ میں ناشتہ کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔

شاید دادی اگر زندہ ہوتی تو مختلف قسم کا نظریہ رکھتی، اس کے نزدیک اگر مرد کمانے جوگا ہو تو پھر اس سے کچھ بھی اور مانگ نہیں سکتے۔ اس کی کفالت ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ٹھہرتی ہے۔

ہمارے زمانے تک عورت اپنے خداداد Goal سے بندھی تھی۔ بچہ عورت کا مستقبل تھا۔ اس کی پرورش اس کا نیچرل فنکشن اور بچہ اس کی زندگی تھا۔ اگر چہ بوجوہ زندگی میں فیل ہو جاتا تو پھر عورت کے لئے کوئی بھی کامیابی باقی نہ رہتی، لیکن اب عورت نے بچے کو پس پشت ڈال کر اپنا مستقبل بنانے، اپنی شناخت تلاش کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ قدرتی فطرتی حیاتیاتی گول ختم ہو جانے کے بعد عورت اب مرد کی طرح کھوکھلی ہو رہی تھی۔ مرد کو ہمیشہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی منزل تلاش کرنا پڑتی ہے۔ کبھی وہ عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ کبھی شراب جوئے

کے لئے دیوانہ ہو جاتا ہے۔شاعر، ادیب، مصور، فنکار اس بات کے شاہد ہیں کہ مرد کو اپنی شناخت کے لئے تخلیق میں شناوری کی بھی ضرورت رہتی ہے، وہ اپنے آپ کو منوانے کے لئے بڑے جتن کرتا اور پاپڑ بیلتا ہے۔جب ایک بار انا کا کوبرا آپ کے پیچھے لگ جاتا ہے تو پھر اس سے جان بچانا مشکل ہے، لیکن عورت بچے کے سہارے اس کی پرورش کی پتوار پکڑ کر اس کے مسائل میں کھوئی اپنی ذات سے نجات پا لیتی ہے، چونکہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔عورت کو بھی وہ ساری Depression, Frustration تنہائی، ٹوٹ پھوٹ کی ضرورت ہے جو پہلے صرف مرد کا مقدر تھا۔ پہلے عورت یک لئے دردزہ کافی تھا۔اب اس نے دردِ دل اور غم روزگار بھی پا لیا ہے اور غزل کے شعر کی طرح اپنی چھوٹی سی کائنات میں طوفان اٹھائے پھرتی ہے۔میں نے ارجمند کو سمجھانے کی کوشش نہ کی۔بھلا کوئی باپ بیٹی کو سمجھا پایا ہے کبھی؟ وہ تو صرف بیٹی کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔

ارجمند کے چلے جانے کے بعد سوچتا ہوں کہ مرد اور عورت ہمیشہ محبت کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔دولت بھی کئی بار اسی توجہ کو حاصل کرنے کے لئے جمع کی جاتی ہے۔عزت نفس، توقیر ذات، خودی کا تصور بھی اسی محبت کے شاخسانے ہیں۔ محبت کی تلاش میں مرد اور عورت کا طریقہ واردات ان کی جسمانی ساخت کی مانند مختلف ہوتا ہے۔عورت نئی محبت کے ساتھ ساتھ پرانی تصویر بھی دل میں ٹنگی رہنے دیتی ہے۔پرانی محبت نو یافت محبت سے مزاحم نہیں ہوتی۔

لیکن مرد کے لئے مکان خالی کرنے کی شرط ہے۔وہ اللہ کی محبت پالنا چاہے کسی عورت کا مفتون ہو، اسے قلب خالی کرنا پڑے گا۔مرد کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس کا محبوب اس کے دل پر نمبروں والا تالا لگا کر صبر کرتا ہے۔شادی کے بعد ماں کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔نئی نویلی دلہن ماں کی تصویر کو دیوار پر بھی برداشت نہیں کر سکتی، چہ جائیکہ اس کی جگہ دولہا کے دل میں ہو۔مرد عورت کے دل سے اس کے مائیکہ گھر کی

یادیں محو نہیں کرتا ..... کبھی بیوی کی ماں کو اپنا رقیب نہیں سمجھتا، لیکن عورت سے دوئی برداشت نہیں ہوتی۔

اگر عورت بچہ جنے تو اس سے مرد یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ صرف پہلوٹھی کے بچے کی ماں ہو۔ ہر بچہ پچھلے بچے سمیت اپنی ماں کا حق دار ہوتا ہے اور مرد تو یہاں تک فراخ دل ہے کہ سوتیلی ماں لانے کے بعد اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ کم از کم میری بیوی سب سے محبت کر سکتی ہے اس لئے سوتیلے کو بھی گود میں لے کر پال دے گی۔ بچے کیک معاملے میں مرد عموماً بدنصیب ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی بچے کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اس کا کفیل بن سکتا ہے، لیکن دروازے پر کھڑا صرف اندر آنے کی اجازت مانگتا رہتا ہے۔ اجازت کبھی نہیں ملتی۔

عورت شادی سے پہلے یا بعد میں محبوب رکھنا چاہے تو چپ چاپ اس کی مورتی پوجا کر سکتی۔ مرد ایک وقت میں دو محبوب رکھنا چاہے تو طوفان آجاتا ہے۔ دوئی سے نکلے بغیر اسے محبت مل نہیں سکتی ..... عورت اللہ میں ڈوبنا چاہے تو سارے پیاروں سمیت اس میں غرق ہو سکتی ہے، لیکن مرد کے لئے حکم دوسرا ہے ..... اللہ کے لئے مکان خالی کرنے کی شرط ہے، سارے رشتے، بت نکال کر پھینکنا پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ مرشد کی شبیہ بھی خارج از خیال کر کے ایکسائی سے رجوع کرنا ہوتا ہے ..... مرد کا سفر تنہائی کا سفر ہے۔ عورت کا سفر میلے میں گھومنے پھرنے، سیر کا علم ہے۔ دونوں اپنے اپنے ظرف بھر قیمت ادا کرتے ملے جاتے ہیں۔

میں ارجمند سے گزر کر اپنے ماضی میں ڈبکیاں لگانے لگتا ہوں۔ بوڑھا آدمی آسانی سے یہی بائی سیکوپ دیکھ سکتا ہے۔ بچے اور ارجمند قریبی بازار سے گروسری خریدنے چلے جاتے ہیں۔ میں دوسری منزل کی بیلکونی سے ہاتھ ملا کر انہیں اللہ حافظ کرتا ہوں۔ جمشید اور قیصر امریکن زندگی میں اوپرے نہیں۔ انہوں نے تیرنا ہی ان پانیوں میں سیکھا، لیکن بلال اور ارجمند جب بھی بولتے ہیں، ان کے لہجے میں پاکستانی

پن ہوتا ہے۔جمشید اور قیصر کی آوازیں، الفاظ ان کی ادائیگی میں امریکن لب ولہجہ کا دبدبا اور کھنک ہے۔وہ ابھی احساس کمتری سے آشنا نہیں۔انہیں معلوم نہیں کہ امریکہ میں وہ ہمیشہ سیکنڈ ریٹ سٹیزن رہیں گے۔خیال میں ہال روڈ کی دوکان ابھرتی ہے۔ تب آپیا کی دوستی اقبال سے زور شور پر تھی، نہ ملنے کی صورت میں خط آتے۔کبھی کبھی میں ان خطوں کی ٹوہ میں آپیا کے کمرے میں چلا جاتا۔پتہ نہیں کسی انسان کو جاننے کی خواہش میں اس کی خوشبو، تحریر، لباس عادات کا کیوں تعاقب کرنا پڑتا ہے، ابھی محبت ٹیلی فون سے محفوظ تھی۔آواز کے سہارے جلد قریب آکر بہت دور چلے جانے کی رسم عام نہ ہوئی تھی، ہمارے عہد میں محبت دیر تک گونگی رہتی، پھر آنکھ مچولی میں بدلتی، کبھی سپاہی چور کو پکڑ نہ پاتا اور کبھی کبھی چور خود تھانے میں حاضر ہو جاتا، لیکن اے ایس آئی موجود نہ ہوتا اور ایف آئی آر نہ لکھی جا سکتی۔کچھ معاشرے کے عطا کردہ حجاب تھے، کچھ اقدار کی تربیت کا حاصل تھا۔مرد اور عورت ایک دوسرے کی پہیلی کو برسوں تک حل نہ کر پاتے اور محبت اندر ہی اندر شہد کا چھتہ تیار کرتی رہتی، کبھی کبھی اسی پھیرو والا پھرولی میں ساری عمر بیت جاتی اور دھاگے کا سرا تک نہ ملتا، گنجلیں تو کیا کھلتیں۔

میں اقبال کی تلاش میں آپیا کے کمرے میں پہنچا۔آپیا پلنگ کے نیچے بیٹھی تھی اور اقبال اس کے لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ابھی ہیر ڈریسر، بیوٹی پارلر، سملنگ سیلون لڑکیوں کی زندگی میں در نہیں آئے تھے اور سہیلیاں ایک دوسرے کے بالوں میں کنگھی پھیر کر خط اٹھاتی تھیں۔کبھی جھوڑا، کبھی دو چوٹیاں اور کبھی کھجوری چٹیا بنا کر خوش ہوا کرتیں۔

''میں آجاؤں آپیا.....''

شادی کی تیاریوں نے آپیا کو بھرپور دھونس والی بہن بنا دیا تھا۔

''آکر پوچھتے ہیں؟''

اقبال نے اپنا گھٹنا آپیا کی کمر میں ٹھوک کر کہا۔'' کیسے بولتی ہیں۔اتنے بڑے شاعر

ہے......''

میری انا کو تھپکی ملی۔ میں مسکرا کر اندر داخل ہو گیا، بید کی کرسی پر ایسے بیٹھا کہ میرا سینہ کرسی کی پشت سے لگا تھا اور دونوں ٹانگیں سیٹ کے ادھر ادھر تھیں۔ ایسے عموماً سرکس کے جوکر بیٹھا کرتے تھے۔ میں کسی طرح اقبال کو ہنسانے کے موڈ میں تھا۔ نہ جانے کیوں مردوں میں یہ خواہش عام ہوتی ہے کہ عورتیں ان کی بات سن کر ہنس دیں۔ ہنسی کی گرین لائٹ انہیں آگے بڑھنے کا سگنل دیتی ہے۔ کافی دیر خاموشی رہی آپا کو جیسے میرا آنا ناگوار گزرا۔ وہ نظریں جھکا کر کنگھی کرواتی رہی۔ اقبال کے ہاتھ بڑی شفقت سے بالوں کی گرہیں کھولتے رہے۔ پتہ نہیں کیوں اور کیسے یہ شفیق لمس مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد اقبال بولی۔ ''تمہارے بال بہت نرم ہیں رفعت آپا۔''

''ساری آنولہ ریٹھا کی مہربانی ہے۔ میں نے کبھی شیمپو استعمال نہیں کیا''

پلکوں کی بھاری چلمن اٹھا کر لحظہ بھر کر اقبال نے میری جانب دیکھا۔ میں آج تک اس نظر کے معنی نہیں سمجھ پایا۔ کیا یہ سوال نظر تھی؟ کیا اس نظر میں توصیف و محبت تھی۔ کیا یہ نظر تنبیہ کرنا چاہتی تھی اور مجھے کانٹے دار جھاڑیوں میں گھسنے سے منع کر رہی تھی؟ کیا اس نظر میں اعتراف شکست تھا یا وہ فتح مندی کے احساس کے ساتھ جھنڈا لہرانے آئی تھی۔ اس چھوٹی سی نظر کے سہارے میں نے کئی دن گزارے، سونے سے پہلے، صبح جاگنے کے بعد میرا سارا وجود ہمک کر اس نظر سے لپٹ جاتا اور اسی نگاہ کو سیڑھی بنا کر اس کی روح میں اتر جانے پر بضد رہتا۔ مجھے ڈائری لکھنے کی عادت تو نہ تھی، لیکن میں سونے سے پہلے اقبال سے ہونے والی ساری ملاقاتوں کو ذہن میں الٹتا پلٹتا، دیکھتا پرکھتا۔ ہم دونوں جب بھی ملتے گھر کا کوئی دوسرا فرد عموماً موجود ہوتا، لیکن جو البم میں نے اپنے اندر بنا رکھی تھی، اس میں صرف اقبال کی تصویریں تھیں۔ میں سونے سے پہلے بڑی دیر تک ان تصویروں کو دیکھتا رہتا۔ ایسے میں مجھے ان گنت ایسے جملے بھی

سنائی دیتے جو اقبال کی زبان سے ادا نہ ہوئے تھے۔ میں خود کئی ایسی باتیں کہتا جن کے کہہ دینے کا کوئی جواز موجود نہ تھا اور جو ہرگز ہرگز کبھی نہ جا سکتی تھیں۔ ہمارے عہد میں محبت عمل میں کم اور خیال میں زیادہ ہوتی تھی۔

ایسے ہی گونگی بہری انجان سی محبت نے میرے اندر ایک پوری کائنات پھیلا رکھی تھی جس کے واقعات فرضی ڈائیلاگ من گھڑت، لمس اچھوتے، اظہار منہ بند اور واقفیت کے لمحے قریب قریب مفقود تھے۔ اس کے باوجود سرکس میں رسی پر چلنے والے شعبدہ باز کی طرح اس محبت کا کرشمہ کبھی دل سے محو نہ ہوا۔ آج کے عہد میں جب ایک ہی شام میں ریسٹورنٹ میں سینڈوچ کھانے اور کافی پینے سے لے کر بیڈ روم تک کے سارے معاملات بھی طے پا جاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اقبال اور میرے درمیان زیادہ سے زیادہ کچھ نہ تھا اور پھر بھی ایک روز میں نے اس کے دوپٹے کو ذرا سا گرفت میں لے کر کھینچا تھا۔ میری آرزو تھی کہ وہ ذرا پیچھے ہو جائے اور میرے گھر کے باقی ہجوم سے ہٹ کر ہم دونوں میں کوئی بات سب سے علیحدہ ان کہی ان بوجھی بھی طے پا جائے۔

اس روز ہم سب شالامار میں پکنک منانے گئے تھے۔ شاہد بھائی بھی ہال روڈ کی دکان بند کر کے ساتھ چلے آئے تھے۔ امی ابو، ہم پانچوں بہن بھائی کے علاوہ چاچا صمد بھی ہمراہ تھے۔ آپیا ہمیشہ کی طرح سہیلیوں کے جھرمٹ میں تھی۔ چاچا صمد اقبال سے ایسی بے تکلفی سے پیش آتے گویا ایک زمانے سے اسے جانتے ہوں۔ اس روز ہم سب نے بڑے مزے دار قیمے کے پراٹھے باغ میں کھائے۔ پہلے دو پیٹیاں آم کی اوپر تلے رکھی تھیں۔ پھر وہ دو ڈھیر چھلکوں کے بن گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس روز بارش ہوئی تھی اور ہوائیں باغ میں دوپٹہ بدل سہیلیوں کی طرح جھول جھول کر چل رہی تھی۔ اندرون شہر کے گھبرائے ہوئے متوسط طبقہ کے لوگ ہماری طرح پکنک منانے آئے تھے۔ ایئر کنڈیشنر کا کرشمہ ابھی عام نہ ہوا تھا۔

پھر ہم سب نے کوٹلہ چھپا کی کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ شرارت چاچا صمد کی تھی۔ امی ابو تو بزرگی جتانے کے بہانے کھیل سے باہر رہنا چاہتے تھے، لیکن چاچا صمد میں بڑی قوت تھی۔ وہ جب کچھ ٹھان لیتا تو پھر کسی روک کو نہ مانتا۔ کچھ چوں چڑا اقبال نے بھی کی۔ وہ غالباً سب کے سامنے بھاگنے سے شرماتی تھی اور کالج میں پڑھنے کے باوجود شرمیلی تھی۔

اس کھیل کے دوران جب چاچا صمد کوڑا گھماتے دائرے میں بھاگتی اقبال کے پیچھے پھنکارتے بھاگے تو اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ مجھ پر گری..... اسی وقت بجلی چمکی اور کڑاکے کا شور ہوا۔ یہی ایک لمس میرے اندر یادگار پاکستان بن گیا۔ مجھے اقبال کے ساتھ اصلی محبت کا کوئی تجربہ نہ ہوا۔ میرے پاس نہ خطوط تھے نہ گل بیوں کی یادیں تھیں۔ نہ شکوے شکایت کے رجسٹر تھے، نہ ہی انتظار کی کوئی داستان تھی۔ ہم دونوں ہم قدم، ہم زبان، ہم مکتب بھی نہ تھے۔ وہ جب بھی میری جانب دیکھتی، میں یہی سمجھتا یہ نظر آب حیات برسا رہی ہے۔ اتنی کم آمیز اظہار سے تہی محبت کا اتنے برسوں میرے تعاقب میں چلے آنا میرے لئے اب بھی عجیب سی بات ہے۔

مجھے یاد ہے جس روز شاہد بھائی کی شادی تھی، وہ اس صبح دیر تک میرے کمرے میں بیٹھے رہے۔ پہلے انہوں نے دو تین بار چائے پی، پھر ماسی جی کی لائی ہوئی اندرون شہر کی بالو شاہیاں کھائیں۔ نروس ہو کر دو تین پان چبا گئے۔ شاہد بھائی کا کچھ عجیب سا موڈ تھا۔ وہ ہاتھوں اور پیروں کی مہندی کے باعث اوپر سے لگ رہے تھے۔ شاہد بھائی نے بڑے ہونے کے ناطے کئی ادھوری پوری قربانیاں دی تھیں۔ انہیں پڑھائی کا شوق تھا، لیکن ابو کی آمدنی کم تھی اور ہم لوگ فضول خرچ نہ ہوتے ہوئے بھی کئی بنیادی ضرورتوں سے محروم رہ جاتے تھے۔ فورتھ ایئر کے امتحان سے کچھ پہلے ہی شاہد بھائی نے اورینٹل کالج جانا چھوڑ دیا۔ انہوں نے ہال روڈ میں ایک چھوٹی سی دکان الاٹ کرالی تھی یا شاید تالا توڑ کر دکان کو ہتھیا لیا تھا۔ اب وہ اپنی دکان پر بجلی کا سامان

مرمت کرتے تھے اور دکان پر چھوڑے ہوئے سامان کو اونے پونے بیچ کر ابو کی مدد بھی کرتے تھے۔ شام کو عموماً وہ کافی ہاؤس چلے جاتے، جہاں انہیں اپنی شاعری سنانے کا موقع تو کم ملتا، لیکن جھہاں شاعر ادیبوں سے بہت سستے داموں ملاقاتیں ہوتی رہتیں ساندھے سے ٹمپل روڈ تک کا فاصلہ چند سالوں میں طے ہو گیا اور شاہد بھائی نہ جانے کیوں کافی ہاؤس بھی جانا چھوڑ گئے۔ وہ اب میری غزلیں نظمیں سن کر بڑے کھلے دل سے داد دیتے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ میں مشاعروں میں حصہ لوں، خاص کر ریڈیو پاکستان کا کوئی مشاعرہ ایسا ہو جس میں میری شرکت لازمی سمجھی جائے۔

''یار تم شاعری کی طرف سے غفلت برت رہے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ایسا ذہن رسا عام نہیں ہوتا.....''

''آپ نے شاعری کیوں چھوڑ دی شاہد بھائی؟''

وہ دیر تک سوچتے رہے جیسے درست جواب تلاش کر رہے ہوں۔

''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں ہمایوں کہ میں مستری ہوں شاعر نہیں ہوں.....''

''یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟.....''

''اندازہ نہیں یقین ہے میرا..... میں قافیے سامنے رکھ کر جوڑ توڑ کیا کرتا تھا۔ مجھے آمد نہیں ہوتی..... آمد اور طرح کی اصلی شاعری ہوتی ہے''

مجھے یقین نہ آیا، کیونکہ میں نے کبھی انہیں ڈکشنری دیکھتے یا قافیہ جمع کرتے نہ پایا، لیکن شاید اصلی وجہ وہ مجھے بتانا نہ چاہتے تھے۔ ان کی خواہش کو میں بھانپ چکا تھا۔

''کیا محبت میں قربانی ضروری چیز ہے؟.....'' اچانک میرے منہ سے نکلا۔

''تم کیوں پوچھتے ہو ہمایوں؟''

''کیونکہ میں جانتا ہوں، آپ نے شاعری میری وجہ سے چھوڑی..... آپ چاہتے ہیں کہ میرے نام کا ڈنکا بجے..... آپ بادشاہ گر ہیں۔ آپ بادشاہ بننے سے کتراتے ہیں، آپ کا مزاج چھوڑنے کا ہے، پکڑنے کا نہیں۔''

''شاید.....''

''بادشاہ کی ذمہ داری سے وزیر گھبراتا ہے۔وزیر کی تدبیر بادشاہ کے لئے مشکل ہے۔آپ شاعر ہونے کی ذمہ داری سے بدک گئے ہیں شاہد بھائی''

''شاید.....شاید.....میں سمجھتا ہوں وہ تمہیں زیادہ پسند کرتی ہے.....''

اچانک شاہد بھائی کے منہ سے بہت بڑی بات نکل گئی۔اب وہ پرندہ واپس پنجرے میں قید نہیں کر سکتے تھے۔

''میرا تو خیال تھا کہ وہ آپ کی طرف مائل ہے.....''

''اب کیا فرق پڑتا ہے،میرا پتہ تو کٹ گیا۔تمہیں اب اس کی توجہ مبارک ہو۔''

شاہد بھائی اٹھ کھڑے ہوئے پھر انہوں نے اپنا مستریوں والا مضبوط ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔اس ہاتھ میں گرمائی،پذیرائی،حوصلہ افزائی اتنا بہت کچھ تھا۔

''یار جتنا وقت انسان خیال کو اصل جانکر ضائع کرتا ہے کاش اتنا وقت حقیقت کے تعاقب میں بسر کیا کرے تو بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔انسان کو خیال نے ہمیشہ ریگستان میں اکیلا چھوڑا ہے''

وہ ایک ٹھنڈی آہ بن کر کمرے سے نکل گیا۔

میں سوچتا رہا کہ انسان کو وقت گزارنے کے لئے اصل ضرورت خیال کی ہوتی ہے یا حقیقت کی؟ وہ وقت کے بوجھ تلے اسی خیال کی مدد سے فرار ہوتا ہے؟ کہ حقیقت اسے باہر نکالتی ہے۔ایک چھوٹی سی کرکٹ کی گیند کے پیچھے ایک دنیا دیوانی ہوئی۔ کرکٹ گیند حقیقت نہیں ہے،اس سے وابستہ ہار جیت ایک تصور ہے،دیکھ لیجئے کتنی خلقت اس گیند کے لئے دیوانہ وار ناظرین کا انبوہ بن جاتی ہے۔جواء یہ گیند کھلاتی ہے،ملکوں کی دشمنی اور دوستی تک اسی ایک ننھی سی گیند سے وابستہ ہو جاتی ہے۔اصل کچھ نہیں،ساری دیوانگی اس خیال کی پیدا کردہ ہوتی ہے جو اس کرکٹ کی گیند سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔

اقبال بھی ایسے ہی ایک تصور تھا جس نے میری زندگی کے سارے مہ و سال ایک خیال سفر میں بدل دیئے..... میں بھی اس تصور کی گیند کے پیچھے بھاگتا بھاگتا نہ جانے کتنی مدتوں اندر ہی اندر آوارہ رہا۔ شاہد بھائی ٹھیک کہتے تھے۔ خیال ریگستاں کا سفر ہے۔

جب سے ترقی نے انسان کو حقیقت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کیا ہے، شعور کو لاشعور سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ انسان اب لاشعور میں بسنے والے خیال کے بجائے شعوری حقیقت کے درپے ہیں۔ وہ اندر کے امکانات، ممکنات کو پس پشت ڈال کر ایسی اشیاء کے تعاقب میں بھاگا پھرتا ہے، جن کو ہم اپنے حواس خمسہ سے پہچان سکیں۔ خیال، سوچ، وسوسہ، وہم، مسلک سب لاشعور کے اہال ہیں۔ اب تخلیق عمل بھی لاشعور کی کرامت نہیں رہا، بلکہ شعور اسے لیبارٹری میں اغوا کر کے لے گیا ہے۔

امریکہ کی ترقی کا راز اس کے مسئلوں میں ہے۔ وہ پہلے شعوری طور پر مسئلہ اختراع کرتا ہے، پھر اس کی ساری جدوجہد، سعی، کوششیں ان ہی ماحولیاتی غموں کے ریچھ کو گھر کی دہلیز سے بھگانے میں صرف ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ لاشعور کی توڑ پھوڑ کسی لیبارٹری میں لے جانے کا نہ تو امریکہ نے ابھی پکا عزم کیا ہے اور نہ ہی اندر کے خیال کے لئے کوئی بھرپور پلانگ ہوسکی ہے۔

امریکہ مسئلے پر جیتا ہے۔ وہ شعوری کوشش سے مسئلے پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور اسی مسئلے سے جینے کی طاقت حاصل کرتا ہے۔ اگر ایک مسئلے کا سلجھاؤ ہو تو کوئی دوسرا مسئلہ اس کی جگہ لے گا۔ اس موذی مسئلہ کی پنیری کبھی ختم نہیں ہوتی۔

امریکہ نے اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اگر غم کو مسئلے کی شکل میں تبدیل کرلیا جائے تو اس کا علاج ممکن ہے، اگر مسئلہ موجود نہ ہو تو انہیں زندگی روکھی پھیکی لگتی ہے۔ وہ خود مسئلہ ایجاد کرتے ہیں۔ ساری ریسرچ اس بات کی مرہون منت ہے، وہ غم کو مسئلہ بنا کر، سلجھاؤ کی طرف قدم اٹھانے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ جونہی آنسو جنم

لے وہ مسئلے کو سمجھ کر اس کے حل کی طرف چل نکلتے ہیں۔ انہوں نے ان گنت مسائل کو لیبارٹری کی طرف دھکیل دیا ہے۔ آج کی ریسرچ کا سچ کل کے تجربات سے جھوٹ ثابت ہوسکتا ہے۔ جب نیوٹن کی تھیوری بنتی ہے، تو وہی تھیوری آئین سٹائن کے لئے درد سر بن جاتی ہے اور وہ اسے چیلنج بھی کرسکتا ہے۔ ساری انڈسٹری، ٹیکنالوجی غموں کا مداوا ہیں۔ مختلف قسم کے مسائل کو سلجھانے کے لئے اتنا بڑا مارکیٹ تیار ہو چکا ہے کہ اب سمجھ نہیں آسکتی کہ یہ سارا بازاری نظام علاج ہے کہ مسئلہ کا ایجاد کرنا؟ لوگوں کے دکھوں کو رفع کرنے کے لئے بازار بھرے چلے جارہے ہیں۔ ایک چکر ہے، شے پہلے ہے کہ حصول زر؟ مسئلہ ضروری ہے کہ اس کا حل؟

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ ہو، بوڑھے لوگوں کو دربدری اور بے عزتی سے بچانے کی مہم ہو، ملازمت میں مشغول ماؤں کے بچوں کی نگہداشت کا مسئلہ ہو، غریب ملکوں کو قرضے اور عطیات پہنچانے کا سوال ہو۔ سفید فام لوگ مسئلے کو شطرنج کا کھیل بنا کر کھیلتے ہیں اور نڈھال نہیں ہوتے۔ سائنس کے گرویدہ انسانی دکھوں کے خلاف پلاننگ میں مشغول رہتے ہیں، لیکن کسی فرد یا معاشرے سے غم کا سیاہ پرندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں ہوتا۔ ملازمت کرنے والی عورتوں کو احساس جرم ستانے لگتا ہے۔ جب ملیریا اور ٹائیفائڈ کا علاج نکل آئے تو ایڈز، کینسر، الزائمر مسئلہ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب گھروں سے بچے، بوڑھے دوست رشتہ دار رخصت کر دیئے جاتے ہیں تو تنہائی کا ریچھ گھر میں بسیرا کرلیتا ہے۔ جب ادویات اور وٹامنز کے استعمال سے عمر لمبی ہو جاتی ہے تو بوڑھوں کی ایسی کھیپ معاشرے کا بوجھ بن جاتی ہے، جن کے لئے نہ مرنے کی دعا کی جاسکتی ہے نہ جینے کی..... لیکن امریکی معاشرہ مسائل کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ وہاں زندگی اور ترقی کا راز ان ہی شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مشرق میں اندر کی فلاح کے لئے جو ڈیرے، مٹھ، سن ڈے سکول، زاویے، گرو، مرشد تھے ان کے علم کو ظنی سمجھ کر مشرقی اکثریت انہیں چھوڑتی چلی جارہی ہے۔

فلاح کی راہ پر چلنے والے غم سے نپٹنے کے لئے صبر کی ڈھال استعمال کرتے ہیں۔ جہاد بالنفس کے معاملے میں اور کوئی منتر ٹونا کام میں نہیں لاتے۔ صبر کا دارو پینے والے شرم وحیا کے ساتھ اپنی تکلیفوں کو راز رکھنے کا طریقہ سیکھ کر غم کے دہکتے کوئلوں کو دم بخت کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔ یہاں غم کی بوٹی کو گھاس سے چننے کا رواج نہیں، بلکہ بغیر آکسیجن دیئے غم کو مار ڈالنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ ان گنت تلواریں، ڈھالیں جو ترقی کی دیوی نے ایجاد کی ہیں اور جہاں جہاں یہ فیل ہو جاتی ہے، وہاں فلاح کا دیوتا ایک صبر کی ڈھال آپ کو پکڑا کر الٹے کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ صابرین کا کہیں نہ کہیں سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، پھر اسی تعلق کی برکت سے بات سننے والے، مدد کرنے والے آپ کے غم میں جھلسنے والے کی موجودگی میں غم کی کاٹ نہیں رہتی۔ یہ تعلق کسی سائیکالوجسٹ، سائیکی ایٹ رسٹ سے اس لئے بھی بڑا ہوتا ہے کہ یہ ہر وقت شہ رگ کے ساتھ رہتا ہے اور انسان آہستہ آہستہ اپنا سارا بوجھ اس پر ڈالنے کا عزم کرنے کے بعد نپچت ہو جاتا ہے..... مسائل پیدا ہوتے ہیں ہوتے رہتے ہیں، لیکن علاج عموماً ایک ہی رہتا ہے..... تعلق!

میں اپنی شہ رگ والے سے کبھی تعلق پیدا نہ کر سکی۔ نہ ہی میں اقبال کے تعلق کا ذکر کسی سے کر سکا، لیکن مجھے لگتا ہے کہ اقبال نے وہی نہ تو مجھے صبر کی ڈھال ہمیشہ پہننے دی اور نہ ہی کسی بڑے آفاقی شہ رگ والے دوست کی تلاش کے لئے فارغ کیا۔

تھری چیر زفار خیال غم.....

تھری چیر زفار صبر کی ڈھال.....

تھری چیر زفار شہ رگ.....

تھری چیر زفار شاہ رگ میں بسنے والا.....

تھری چیر زفار اقبال.....

خیال ہی خیال.....

میں دروازہ کھولتا ہوں۔

یہ دروازہ چوروں کے ڈر سے دو تین الٹ پھیروں سے کھلتا ہے۔ آخر میں دروازے کی زنجیر اتار کر لٹکانی پڑتی ہے۔ اس دوران گھنٹی دو ایک مرتبہ مزید بجتی ہے۔ ریڈ وڈ کا خوبصورت دروازہ کھل کر دھوپ کا ایک لمبا تختہ اندر سفید قالین پر بچھا جاتا ہے۔ میں کمرے سے نکل کر دو سیڑھیاں نیچے اتر کر دیکھتا ہوں۔ سامنے دو انگریز صورت امریکن کھڑے ہیں۔ لگتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد بوسٹن ٹی پارٹی میں شریک ہوئے ہوں گے۔ عورت اور مرد دونوں خوبصورت دراز قد تھوڑے سے جھکے جھکے بڑے خوشگوار چہروں سے مجھے صبح بخیر کہتے ہیں۔ میں جواباً خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔

''جی ہم اندر نہیں آنا چاہتے .....صرف کھڑے کھڑے آپ سے چند باتیں کرنا تھیں''۔

وہ عام امریکنوں کی طرح کالے آدمی سے تھوڑے سے خائف بھی ہیں اور اسی لئے اندر آنا نہیں چاہتے۔ مڈل کلاس امریکن تارکین کی مشکلات تو سمجھتا ہے اور انسانی حقوق کے پیش نظر ان تارکین کے لئے سہولتوں کا بھی خواہش مند ہے، لیکن وہ ایشیائی اور افریقی لوگوں سے خوفزدہ بھی ہے، کیونکہ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ مشرقی لوگ جلد کے میلے ہونے کے ساتھ ساتھ دل کے اجلے بھی ہیں یا نہیں۔ جب انسان فرق کو سمجھ نہیں پاتا تو خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس اجنبی مرد اور عورت کا بھی تھا۔

''ہم لوگ واچ ٹاور کی طرف سے آئے ہیں اور آپ کی توجہ چاہتے ہیں''۔

مجھے تھوڑی سی معلومات واچ ٹاور کی ہیں، جن کی بناء پر میں ان کو پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ عیسائی مشنری ہیں اور عیسائیت کا پرچار کرنے کی خاطر گھر گھر پھرتے ہیں۔

''آپ اندر آجائیں .....'' میں اصرار سے کہتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ مہمان

نوازی کے منافی ہے کہ میں ان سے گھر کے باہر شارع عام پر باتیں کروں۔

''جی نہیں شکریہ۔ ہم اندر نہیں آسکتے۔ ہمارے پاس تھوڑا وقت ہے۔ کیا آپ قیامت پر یقین رکھتے ہیں؟'' عورت پوچھتی ہے۔

''جی ہم مسلمان کا ایمان ہے کہ روز جزا ہے۔ ہم ایمان بالغیب پر پورا یقین رکھتے ہیں۔''

''آپ جانتے ہیں کہ اللہ کی بادشاہت آنے والی ہے.....''

''جی ضرور.....''

لڑکی نما عورت کے دانت سگریٹ کی وجہ سے دھواں سے ہیں، لیکن اس کی نیلی آنکھیں بہت شفاف ہیں۔

''ہم اپنے اعتقادات کو پھیلانے کی خاطر کچھ لٹریچر لائے ہیں۔''

میں ایسے شکنجوں میں اپنے آپ کو پھنسانا نہیں چاہتا۔ میں بقول مولانا اشرف علی تھانوی اس بات کا قائل ہوں کہ اپنا مسلک چھوڑو، نہیں کسی اور کا مسلک چھیڑو نہیں۔ میں ایک اور طرح سے Secular آدمی ہوں۔ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر لمبا مرد اپنی مسکراہٹ کے ساتھ کچھ تبلیغی لٹریچر میری جانب بڑھاتا ہے۔

''یہ بالکل مفت ہے۔ ہم واچ ٹاور والے اسے لوگوں کی فلاح کے لئے بانٹتے ہیں۔ دیکھئے آج کا انسان ایمان کی کمی کے باعث بربادی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ میں چند سال پہلے Gay تھا۔ شاید آپ کو علم ہو کہ اس سال Gays کی ایک بہت بڑی ریلی .....ٹورنٹو میں ہوئی ہے۔ میں قوم لوط کا بندہ تھا، لیکن پھر ایک دن میرے ہاتھ یہ واچ ٹاور کا رسالہ آگیا اور جیسے مجھے اللہ کے بیٹے یسوع مسیح نے خود آواز دے کر لاسٹ سپر میں شامل کرلیا..... میرا بپتسمہ کیا اور مجھے ایسے کر دیا جیسے نوزائیدہ بچہ..... آپ؟.....''

وہ ہچکچا گیا اور نہ پوچھ سکا کہ میرا مذہب کیا ہے؟

''میں مسلمان ہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ روح اللہ ایسے معجزے کر سکتے ہیں۔ میرا یہ

بھی اعتقاد ہے کہ حضرت مسیح کو صلیب پر نہیں چڑھایا گیا، بلکہ انہیں زندہ اٹھایا گیا اور وہی مسیح موعود بن کر دوبارہ آئیں گے اور شریعت محمدی ﷺ کو نافذ کریں گے۔ وہ معجزے سے پیدا ہوئے اور معجزے میں ہی ان کی تکمیل ہوگی، لیکن آپ کے اعتقاد کے مطابق میں انہیں اللہ کا بیٹا نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ میرا ایمان ہے اللہ واحد ہیہ۔ نہ وہ کسی سے پیدا ہو نہ اس سے کوئی جنا..... باقی میرے نزدیک روح اللہ کی قدر منزلت میں بطور نبی نہ کسی قسم کی کمی ہے نہ شک کی گنجائش....."

وہ دونوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ میں چونکہ بنیاد پرست ہوں، اس لئے عین ممکن ہے کہ میں دہشت گرد بھی ہوں۔

"میں آپ کو حضرت مسیح کی طرف دعوت دینے آئی ہوں..... میں کئی سال شلٹر میں رہی ہوں۔ میرا شوہر شراب پی کر مجھے پیٹتا تھا۔ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دیتا تھا میں گھر سے بھاگ کر شلٹر میں چلی گئی۔ جہاں ایک روز میری کھڑکی میں اتنا اجالا ہوگیا کہ کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ میں گھٹنوں کے بل ہوگئی۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا..... آواز آئی تم میری بھیڑ ہو، گلے میں واپس آجاؤ..... میں نے..... صبح ہی اپنے شوہر کو فون کیا کہ میں نے اسے معاف کر دیا ہے، کیونکہ یسوع مسیح نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ پھر مجھے رابرٹ مل گیا" اس نے لمبے مرد کی طرف محبت سے دیکھا۔

میں نے مسکرا کر دونوں کا شکریہ ادا کیا اور لٹریچر کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے پمفلٹ پکڑ لئے۔

"یہ ایک کاپی رسالے کی بھی میں آپ کو دے رہی ہوں۔ اگر آپ اسے مفید سمجھیں تو آپ ہمیں فون کر دیں۔ ہم باقاعدگی سے اسے بھی آپ کو بھجوا سکتے ہیں۔"

میں نے رسالہ پکڑ کر پوچھنا چاہا کہ ان دونوں کا اب باہم کیا رشتہ ہے، لیکن میں چپ رہا۔ دیہی اور شہری آبادی میں ایک بڑا واضح فرق یہ بھی ہے کہ دیہی علاقوں کے لوگ رابطے کی زبان جانتے ہیں۔ راہ چلتے وہ ایک دوسرے کے متعلق ساری انفرمیشن

حاصل کر لیتے ہیں۔ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل ہو جاتے ہیں۔وہ ہمیشہ لوک ریت کے سہارے قریب آجاتے ہیں،لیکن شہری آدمی کو تخلئے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ وقت کو درست استعمال میں لانا چاہتا ہے۔اس کے لئے کام اہم ہے،رابطہ اہم نہیں۔جس عہد میں انگریز کی حکومت اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ اس کی مملکت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا،اس زمانے میں انگریز کی قوت اس بات میں مضمر تھی کہ وہ بغیر تعارف کے کسی سے گفتگو نہ کرتا۔ٹرین،بس،پارک ایسی جگہوں میں جہاں لوگ ہوتے وہ اخبار یا کتاب کی سکرین کے پیچھے چلے جانے کا فن جانتا تھا اور فاصلوں کو قائم رکھ کر ڈسپلن کا ہوا قائم کر لیتا ہے۔

میں نے ان سے نہ پوچھا کہ کیا انکے بچے تھے۔پیچھے سے وہ اطالوی تھے کہ آئرش ..... کیا ان کا تعلق ناروے کے Vikings کے ساتھ تھا کہ وہ فرانس کے تہذیب یافتہ لوگوں میں سے تھے۔بغیر کسی قسم کی انفرمیشن حاصل کئے ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔میں سوچتا رہ گیا کہ کیا معلومات کے بغیر رابطے قائم کئے جا سکتے ہیں؟میرے دل کے شیطان نے میرے کان میں کہا،شاید انکی شادی نہیں ہوئی۔اس معاشرے میں شادی کے بغیر اکٹھے رہنے میں کوئی قباحت نہیں۔پھر میرے نفس نے سوال کیا، کیا بغیر شادی کئے اکٹھے رہنے کے ساتھ ساتھ انسان مشنری بھی ہو سکتا ہے؟ انسان کب تک نیکی کے اندر بدی اور بدی کے بہتر نیکی کا بیج اٹھائے پھرے گا۔اسے اپنے اندر چھپے ہوئے تضادات سے کب چھٹی ہو گی؟ انسان کیا اپنی دوئی سے رہائی پا سکتا ہے؟

تضادات میں سب سے اہم اور صدیوں پرانا انسانی پنڈولیم کو متاثر کرنے والا تضاد مذہب اور جنس ہے ..... یہاں سفر تیزی سے بھی ہوتا ہے یکلخت بھی، Matamorphosis بھی ہو سکتا ہے اور کبھی کبھی مذہب سے جنس تک انسان ایک عمر میں پہنچتا ہے۔جب کبھی اللہ والا اندر سے پوری آگاہی،ارادے اور شعوری

کوشش سے اپنے آپ پر جنس کا دروازہ بند کرتا ہے، چوری چھپے کی آشنائی کو اپنے لئے کسی معقول یا نامعقول وجہ سے حرام سمجھ لیتا ہے تو پنڈولم مذہب کی جانب سفر کرنے لگتا ہے۔ جب عیسائی دنیا میں مذہب کا دور دورہ تھا اور جنس پر واضح اور غیر واضح پابندیوں تھیں۔ مذہب کی لطافتیں آرٹ، لٹریچر، رسم و رواج غرضیکہ زندگی کے تمام Ritual میں لہو رنگ بھرتی تھیں۔ جونہی مغربی دنیا نے معاشی ضروریات کے تحت، ترقی کی خاطر، پنڈولم پوری آزادی، رفتار اور پہچانکے ساتھ جنس کی طرف موڑا۔ سبھی آرٹ، لٹریچر غرضیکہ تمام فنون لطیفہ اس بات کے عینی شاہد ہیں کہ آرٹ کی روح رواں بھی اچانک جنس بن گئی۔ پوری آزادی اور بھگدڑ کے ہمراہ جنس کو پوجنے اور آخری مسیحا سمجھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا، لیکن آج کا مغربی انسان یہ بھولتا ہے کہ انسانی تضادات کے درمیان دونوں Poles کبھی بھی غیر اہم نہیں ہو سکتے۔ سفر جاری رہتا ہے۔ ایک قطب سے دوسرے قطب کی جانب کشش لازمی ہے بہت کم لوگ ایسے ہوا کرتے ہیں جو اپنے پنڈولیم کو وسط میں روک سکیں یا روکے رکھیں۔ یہ سفر ازلی ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ مذہب سے جنکی جانب ..... اور جنس سے مذہب کی طرف۔

کبھی میں گھوڑے کی نعل جیسے سپر مارکیٹ میں چلا جاتا ہوں۔ پہلے پہلے یہاں کے سپر سٹور میری دلچسپی کا باعث تھے۔ میں ضروری اور غیر روری اشیاء کی چھان پھٹک میں لگا رہتا تھا۔ مفت کوپن جمع کرتا رہا۔ ان لوگوں کے مارکیٹنگ Tactics کا شکار ہو جاتا، لیکن اب مجھے علم ہو چکا ہے کہ بازار ایسی چیزوں کی اشتہا بڑھا دیتے ہیں، جن کی نہ گھر پر جگہ ہوتی ہے نہ ضرورت، تھوڑے دن گھر پر مہمان رہ کر ان چیزوں کو یا تو جنک یارڈ میں پھینکنا پڑتا ہے یا کسی کو تحفہ دے کر جان چھڑانا پڑتی ہے۔ لوگ ٹرولیاں لے کر ایک ڈپارٹمنٹ سے دوسرے تک چکر پر چکر لگاتے ہیں۔ عام طور پر انہیں معمولی سودا سلف خریدنا ہوتا ہے، لیکن جلد ہی ان کی ٹوکری اتنی بھر جاتی ہے کہ سامان

لڑھکنے لگتا ہے۔امریکی لوگ تو پھر بھی ضرورت بھر خرید کر رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن ایشیائی، مڈل ایسٹ اور چینی جاپانی کے لوگ بڑے تجسس سے سامان دیکھتے، ہٹوہ پھرولتے اور لدے پھندے جاتے ہیں۔

میں عموماً دو چار معمولی چیزیں خریدنے کے بعد بازار کے باہر بنے برآمدے میں ایک کافی شاپ میں جا بیٹھتا ہوں۔کافی شاپ والوں نے برآمدے میں بھی گول میزوں کے گرد کرسیاں لگا رکھی ہیں، جہاں بیٹھ کر کافی شناس گاہک کافی بھی پیتے ہیں اور بازار کا جائزہ بھی لیتے رہتے ہیں۔

میں کافی کے ساتھ چیز برگر کھانے میں مشغول تھا۔جب میری نظر کاپارک سے آگے چھوٹے سے لان پر پڑی، وہ پھر سر کو سینے میں پیوست کئے بیٹھا تھا۔اس کا چہرہ چاچا صمد سے مشابہ تھا، لیکن چہرے پر ویسی بشاشت نہ تھی۔نہ جانے کیوں نے کافی ختم کرنے کے بعد اس کی طرف رخ کیا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں.....''

ابرو اٹھا کر اس نے میرا جائزہ لیا، جیسے میں اس کی آزادی میں مخل ہوا۔

''بیٹھے.....'' وہ خشکی سے بولا۔

پیلی Sweat Shirt اور نیلی جینز کے اوپر اس نے ڈھیلی ڈھالی جیکٹ پہن رکھی تھی، جس کی جیب پر میرا ڈونافٹ بال پلیئر کی تصویر تھی۔بال ان دھوے، دانت میلے اور شیو بڑھی ہوئی، ہاتھوں کے ناخنوں میں چکٹ تھی۔میں سوچ میں پڑ گیا نہ جانے یہ نوجوان کون سا نشہ کرتا ہے۔ایل ایس ڈی کہ مری جوانا.....شراب کہ ہیروئن .....اس کے بھرے چہرے پر نشئی آدمی کی مایوسی تھی۔کچھ دیر ہم خاموش رہے۔میں اس کی سوچ میں مخل نہ ہونا چاہتا تھا، لیکن جونہی وہ اٹھا، میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی جیکٹ پکڑ لی۔

''میں تمہارا ہم وطن ہوں، کیا مجھ سے بات نہیں کرو گے؟''